اشعارِ رضا کی توضیح

ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی

٭٭٭ سوال ٭٭٭

لے خبر جلد کہ غیروں کی طرف دھیان گیا
میرے آقا، میرے مولا، تیرے قربان گیا

پورا شعر جو ظاہری مفہوم پیش کر رہا ہے وہ شایانِ شان نہیں۔

٭٭٭ توضیح و تشریح ٭٭٭

یہ شعر نہ صرف اعلیٰ حضرت کے شایانِ شان بلکہ ان کے کمالِ عشق و محبت کا آئینہ دار ہے۔ بتقاضاے بشری ذہنِ انسانی اپنے مقصود و مطلوبِ حقیقی سے عارضی و لمحاتی طور پر ہٹ کر غیروں کی طرف بھی منتقل ہو جایا کرتا ہے۔ امامِ عشق و محبت کو ایک آن کے لیے بھی غیروں کا خیال اور ان کی طرف دھیان گوارا نہیں۔ اگر کسی لمحہ یہ عارضی صورت نمودار بھی ہوتی ہے تو جذبۂ عشق و محبت تڑپ اٹھتا ہے اور اپنے محبوب و مطلوبِ حقیقی کے خیال میں ہمہ وقت مشغول و منہمک رہنے والا عاشقِ زار عارضی و لمحاتی طور پر بھی اس کو گوارا نہیں کر پاتا اور عالمِ اضطراب میں اپنے بھرپور جذبۂ فدائیت کے ساتھ عرض کرتا ہے، فریاد کرتا ہے کہ ”اے میرے محبوب، آقا و مولا! میں آپ پر قربان، میرے حالِ زار پر رحم فرمایئے، میری خبرگیری فرمایئے اور اپنے علاوہ غیروں کی طرف عارضی التفات سے بھی باز رکھیے۔ بس رات دن میں آپ کے خیال اور تصور ہی میں از خود رفتہ اور محو و مستغرق رہا کروں۔ دل و دماغ میں کسی لمحہ بھی غیروں کے خیال کا گزر نہ ہونے پائے۔

٭٭٭ سوال ٭٭٭

تجلّیِ شبِ اسریٰ ابھی سمٹ نہ چُکا
کہ جب سے ویسے ہی **کوتل** ہیں سبز ہاے فلک

شعر کی تشریح کے ساتھ **”چُکا“** کا استعمال شعرا کے یہاں ملتا ہے؟

٭٭٭ توضیح و تشریح ٭٭٭

”چکنا“ مصدر ہے، اس کا فعلِ ماضی ”چُکا“ ہے، جس کا استعمال از روے قواعد درست ہے اور یہ مکمل و ختم و تمام ہونے کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ استاذ الشعرا ذوق دہلوی کا ایک شعر ہے۔

پروانے سے کہتی تھی یہ شمع کہیں چل چک
ہے تجھ میں اگر جرأت، کیوں دیر لگائی ہے

یہاں ”چک“ کا استعمال بصیغہ امر ہوا ہے۔ شعر کا واضح مفہوم یہی ہے کہ حضور پُر نور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سفرِ معراج کے مبارک موقع پر شبِ معراج جو افلاک کی آرائش و زیبائش کی گئی تھی وہ اب تک ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ سبزہ ہاے فلک کوتل یعنی آراستہ و پیراستہ گھوڑے کی مانند اب تک موجود اور باقی ہیں۔

واضح ہو کہ ”کوتل“ اُس گھوڑے کو کہتے ہیں جو امیروں کی سواری کے آگے آراستہ و پیراستہ کر کے محض سجاوٹ اور دکھاوے کے لیے رکھے جاتے ہیں۔

”سبزہ“ جہاں شادابی و تازگی وغیرہ کے معنیٰ میں آتا ہے، وہیں سفیدی مائل بہ سیاہی گھوڑے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ فرہنگِ آصفیہ میں منجملہ دیگر معانی کے یہ معنیٰ بھی درج ہے۔

”سبزہ“ وہ گھوڑا جس کی سفیدی مائل بہ سیاہی ہو۔

گویا (بطور استعارہ و کنایہ) افلاک کے سجے سجائے گھوڑے اب بھی موجود ہیں، ان کی آرائش و زیبائش، دل کشی و رعنائی، خوب صورتی و دل آویزی معراج کے دولھا کی جلوہ پاشی اور فیوض و برکات کے باعث اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

اسی مفہوم کو اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے اپنی دوسری نعتِ پاک کے ایک شعر میں یوں ظاہر فرمایا ہے۔

رضؔا یہ سبزۂ گردوں ہیں کوتل جس کے موکب کے
کوئی کیا لکھ سکے، اس کی سواری کے تجمل کو

٭٭٭ سوال ٭٭٭

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھ والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

"آنکھوں والوں / آنکھ والوں / آنکھ والے" صحیح کیا ہے، دوسرا کیوں نہیں ہوگا؟

*** توضیح و تشریح ***

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

"وَلَمَّا جَاءَ مُوسَى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَن تَرَانِي وَلَٰكِنِ انظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ."

ترجمہ: اور جب موسیٰ ہمارے وعدے پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام فرمایا، عرض کی اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا، پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا، اسے پاش پاش کر دیا، اور موسیٰ گرا بے ہوش۔ پھر جب ہوش آیا، بولا پاکی ہے تجھے، میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ (کنز الایمان)

اور سورۂ والنجم میں ارشاد ہے: "ما زاغ البصر و ما طغیٰ"۔ آنکھ نہ کسی طرف پھری نہ حد سے آگے بڑھی- اس آیت کی تفسیر میں علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "اس میں رسول اللہ ﷺ کے کمالِ قوت کا اظہار ہے کہ اس مقام میں جہاں عقلیں حیرت زدہ ہیں، آپ ثابت رہے۔ اور جس نور کا دیدار مقصود تھا اس سے بہرہ مند ہوئے۔ نہ مقصود کی دید سے آنکھ پھری نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح بے ہوش ہوئے، بلکہ اس مقامِ عظیم میں ثابت رہے۔"

مسلم شریف کی حدیثِ پاک ہے کہ "رأيت ربي بعيني و قلبي." "حضرت موسیٰ علیہ السلام تجلیاتِ ربانی کے مشاہدے کی بھی تاب نہ لا سکے اور غش کھا کر گر پڑے اور سرورِ انبیا محبوبِ کبریا ﷺ نے شبِ معراج نہ صرف تجلیاتِ ربانی بلکہ ذاتِ ربانی کا مشاہدہ فرمایا اور: "ما زاغ البصر و ما طغیٰ". کی منزلِ استقامت پر فائز رہے۔ نہ انوارِ ذاتِ الٰہی کی دید سے آنکھ کسی دوسری جانب پھری اور نہ غش کھا کر گرے۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں اور ان احوال و کوائف کے تناظر میں کس کی آنکھوں کی ہمت و استقامت قابلِ ترجیح اور لائقِ توصیف ٹھہری۔ ظاہر ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ مقدسہ اور آپ کی تابِ دید ہی قابلِ ستائش ہوئی اور انھیں مبارک آنکھوں کی ہمت و استقامت پر سلام بھیجنا زیادہ قرینِ قیاس ٹھہرا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیا و رسل علیہم الصلاۃ والسلام پر حضور اکرم ﷺ کی اولیت و فضیلت مسلم ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: "تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعض". فاضلِ بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی — سب سے بالا و والا ہمارا نبی

اب "آنکھ والوں، آنکھوں والوں، آنکھ والے" کے تعلق سے کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں پروفیسر منیر کعبی کے مندرجات نقل کر کے اپنا موقف واضح کروں: "اعلیٰ حضرت کا شعر "حدائقِ بخشش" میں اس طرح ہے۔

کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھوں والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

جناب ناظم نے دوسرے مصرعے میں ترمیم کی ہے۔ اب مصرعِ ثانی خوانِ رحمت میں یوں ہے:

ع آنکھ والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام

ناظم نے جو مصرعے متضمن کیے ہیں وہ اس قدر جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں کہ آپس میں بھی مربوط نہیں۔ اور اگر ان کے مصرعوں کو سامنے رکھیں تو (آنکھ والوں) ہی مناسب نظر آئے گا۔ اعلیٰ حضرت نے اگر "آنکھوں والوں" استعمال کیا ہے تو وہ بھی روزمرہ کے مطابق ہے اور اس میں احترام کی صورت موجود ہے۔ فقرا جب گدایانہ ملتجی ہوتے ہیں تو ان کا ایک مقولہ ہوتا ہے "آنکھوں والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔" (علمی اردو لغت) ۔ ایک اور بات یاد رکھنی لازم ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اہلِ زبان سے ہیں اور نہایت بلند عالم و فاضل اہلِ زبان۔

"آنکھوں والوں" اس لیے بھی ضروری ہے کہ جمع کا صیغہ ہے اور اشارہ دو عظیم اولوالعزم رسولانِ کرام علیہما الصلاۃ والسلام کی جانب۔ دونوں لفظوں کو جمع کی صورت میں لانا خود جناب ناظم کے یہاں مستعمل ہے۔ دیکھیے! حفیظ کے لیے لائے گئے القاب میں "نعوت نگاراں" یہاں قائد نعوت نگاراں درست تھا مگر انھوں نے "نعوت نگاروں" لکھا ہے۔ جناب شمس بریلوی نے جو "حدائقِ بخشش" ۱۹۷۶ء میں مرتب کر کے مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی کی جانب سے شائع کی، اس میں اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے مصرعے کو علیٰ حالہٖ قائم

رکھا، مگر تضمین کرتے وقت اس مصرع کو تبدیل کر دیا اور کہا کہ "آنکھ والے کی ہمت پہ لاکھوں سلام" اور "آنکھ والے" انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مقدس کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا۔ حالاں کہ مضمون کا تسلسل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام تک ہی نہیں۔ مشاہدۂ انوارِ الٰہی میں حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس و اطہر بھی شریک ہے جس کی سمت مضمون کے سیاق و سباق سے بتصریح اظہار موجود ہے۔ تحریف کے بعد دو تراکیب سامنے آتی ہیں "آنکھ والے"۔ اس میں ایک طرف شوخی ہے تو دوسری طرف تکلف کا پہلو نکلتا ہے جو ادب کے خلاف ہے۔ اور "آنکھ والوں" پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ شاید اس سے ایک آنکھ والے مراد ہیں اور یہ بھی توہین ہے۔"

پروفیسر منیر کعبی کا یہ قول کہ "آنکھ والے میں ایک طرف شوخی اور دوسری طرف تکلف کا پہلو نکلتا ہے جو ادب کے خلاف ہے۔ اور "آنکھ والوں" پر غور کیا جائے تو اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ شاید اس سے ایک آنکھ والے مراد ہیں اور یہ بھی توہین ہے۔"

مجھے اس میں کلام ہے آنکھ بصیغۂ واحد بمعنیٰ جمع کثیر الاستعمال ہے اور نہ ان میں اہانت ہے نہ شوخی، نہ یک چشمی کا عیب، جب تک کوئی قرینہ اس پر دال نہ ہو۔ خود حدیثِ پاک میں بصیغۂ واحد بمعنیٰ جمع مستعمل ہے اور ہر عیب و نقص سے پاک و منزّہ ہے۔ مسلم شریف کی مرفوع حدیث ہے کہ: "رأیت ربی بعینی و قلبی" فارسی میں بھی چشم بمعنیٰ جمع کثیر الاستعمال ہے۔

چشم بکشا زلف بہ شکن جانِ من   چشم ما روشن و دلِ ما شاد

اب آیئے اردو زبان میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں آنکھ کا استعمال بلا تکلف بطور جمع و اسم جنس کیا گیا ہے اور کسی کو ان میں یک چشمی اور دیگر نقائص کا احساس تک نہیں ہوتا۔

آنکھ محوِ جلوۂ دیدار، دل پر جوشِ دید
لب پہ شکرِ بخششِ ساقی، پیالی ہاتھ میں

آہ وہ آنکھ کہ محرومِ تمنا ہی رہی
ہائے وہ دل جو ترے در سے پُر ارمان گیا

کل تو دیدار کا دن اور یہاں
آنکھ بے کار ہے کیا ہونا ہے

آنکھ کھولو غم زدو، دیکھو وہ گریاں آئے ہیں
لوحِ دل سے نقشِ غم کو اب مٹائے جائیں گے

آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

اب دوسرے مستند شعرا کے کلام میں آنکھ کا استعمال بصورتِ جمع و اسم جنس ملاحظہ فرمایئے۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے (سودا)

لہو کے دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے (غالب)

تجھ پہ پڑتی ہے یار سب کی آنکھ
چشم بد دور ہے غضب کی آنکھ (داغ)

بھر گیا دامنِ نظارہ گلِ نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تو نے ادھر دیکھ لیا (آتش)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (اقبال)

ان تمام امثال و نظائر کی روشنی میں "آنکھ والے" کا استعمال غلط نہیں قرار دیا جاسکتا اور نہ اس کے استعمال میں کسی عیب و نقص کا شبہہ کیا جاسکتا ہے جب تک کہ کوئی قرینہ دال نہ ہو۔ بایں ہمہ کمالِ احتیاط اور ہر قسم کے ریب و شک سے پاک، ادب و احترام سے مملو "آنکھوں والے" کا استعمال زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، یعنی:

"آنکھوں والے کی ہمت پہ لاکھوں سلام"

"آنکھوں والوں" میں اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور سرورِ کائنات ﷺ دونوں کی ذاتِ گرامی اور ان کی تابِ دید کو شامل کر کے سلام بھیجنے کی بات کی جائے تو حضورِ اکرم نورِ مجسم ﷺ کی انفرادی خصوصیت اور امتیازی صفت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر دیدار کی ہمت کا نہ پایا جانا اور نورِ الٰہی کے دیدار کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گر پڑنا اور حضور ﷺ کا ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ فرمانا اور رویتِ ذاتِ باری تعالیٰ کی ہمت و استقامت کا پایا جانا امر واقعہ ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

معنیِ قد رأیٰ مقصدِ ما طغیٰ
نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

تبارک اللہ شان تیری، تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہاں تو وہ جوشِ "لن ترانی" کہاں تقاضے وصال کے تھے؟
نہ عرش ایمن نہ انی ذاهب میں میہمانی ہے
نہ لفظ ادن یا احمد، نصیبِ لن ترانی ہے

*** سوال ***

حورِ جناں ستم کیا، طیبِ نظر میں پھر گیا
چھیڑ کے **پردۂ** حجاز، **دیس** کی چیز گائی کیوں
خصوصاً مخطوطہ اشعار کی تشریح؟

*** توضیح و تشریح ***

تشریح الفاظ:-

حورِ جناں— بہشت کی خوب صورت عورتیں۔
ستم کیا — عجیب کام کیا، بڑھ کا کام کیا۔
پھر گیا — گردش کرنے لگا، گھومنے لگا
پردۂ— چلمن، چک، اوٹ، مقاماتِ موسیقی جیسے پردۂ عشاق
حجاز — ملک عرب میں ایک مشہور و مقدس مقام اور مقاماتِ موسیقی میں سے ایک مقام۔
دیس — ملک، علاقہ، ایک راگ جو نصف شب کے بعد گایا جاتا ہے۔
چیز — شے، اسباب، جنس، زیور، حقیقت، گیت، راگ، ٹھمری، غزل وغیرہ۔ (ماخوذ از فرہنگ آصفیہ)

بہارِ شریعت (جنت کا بیان) حصہ اول، ص: ۵۱-۵۲ پر مذکور ہے کہ "جب کوئی بندہ جنت میں جائے گا تو اس کے سرہانے اور پائنتی دو حوریں نہایت اچھی آواز سے گائیں گی، مگر ان کا یہ گانا، یہ شیطانی مزامیر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ عز و جل کی حمد پاک ہو گا۔ وہ ایسی خوش گلو ہوں گی کہ مخلوق نے ایسی آواز کبھی نہ سنی ہو گی اور یہ بھی گائیں گی کہ ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، کبھی نہ مریں گی، ہم چین والیاں ہیں، کبھی تکلیف میں نہ پڑیں گی، ہم راضی ہیں کبھی ناراض نہ ہوں گی، مبارک اس کے لیے جو ہمارا اور ہم اس کے ہیں۔"

"فھم فی روضة یحبرون." (سورۂ روم پ:۲۱، رکوع:۱۴، آیت:۱۵)

ترجمہ: باغ کی کیاریوں میں ان کی خاطر داری ہو گی۔

حضرت امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ "اس میں اسی سماع کا ذکر کیا گیا ہے جو اہلِ جنت بہشت کی خوب صورت حوروں کی دل کش اور مترنم آوازوں میں سنیں گے کہ وہ گا رہی ہوں گی جیسا کہ حدیثِ پاک میں ہے: ہم ہمیشہ زندہ رہنے والیاں ہیں، ہمیں کبھی موت نہیں آئے گی، سدا نرم و نازک اور تر و تازہ رہیں گی، ہم پر کبھی بڑھاپے کی سختی نہیں آئے گی۔" (ترجمہ کتاب اللمع، ص:۴۵۴)

ان روایات سے ثابت ہے کہ بندۂ مومن جب جنت میں داخل ہو گا تو اس کے اکرام و اعزاز اور دل بستگی کے لیے حوریں نشاط انگیز و طرب آگیں نغمے گائیں گی اور یہ نغمات حجازی لے میں یعنی عربی زبان میں گائیں گی جو جنت کی زبان ہے اور حجازِ مقدس کی بھی اور یہ حوریں فردوس یعنی اپنے علاقہ (جنت) کی اور خود اپنی خوبیاں اپنے دل کش نغموں کے ذریعہ بیان کریں گی۔ نغموں کے اس حجازی رنگ و آہنگ اور حوروں کی اپنی اور جنت کی بہاروں کی تعریف و توصیف کے باعث شاعر جو عاشقِ رسول ہے اور رسول کے دیار اور گلی کوچے سے بے پناہ قلبی لگاؤ اور الفت و محبت رکھتا ہے، اس کی نظروں میں مدینہ طیبہ کا نقشہ پھر جائے گا۔ اس کے حسین و دل کش مناظر نظروں کے سامنے گھومنے لگیں گے، کیوں کہ محبت کی نفسیات یہ ہے کہ

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

"حورِ جناں ستم کیا" پر بعض لوگوں نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ جنت تو عیش و نشاط کی جگہ ہے، وہاں پر ظلم و ستم کا کیا معنیٰ؟ — پھر حورانِ بہشت کی طرف ستم کا انتساب کیوں کر درست ہے؟ — تو میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ "ستم" جہاں ظلم و تعدی اور بیداد و جفا کے معنی میں آتا ہے، وہیں غضب اور چالاک کے معنی میں بھی آتا ہے۔ محبت اور پیار سے بھی معشوق شوخ و طنّاز اور ستم گر کہا جاتا ہے۔

ستم کرنا ظلم و بیداد کرنے کے علاوہ غضب کرنا اور کوئی نئی عجیب بات کہنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ اور ستم کیا، بطور محاورہ عجیب کام کیا، بڑھ کا کام کیا کے معنیٰ و مفہوم میں بھی مستعمل ہے۔ لہٰذا لفظ "ستم" کا استعمال اگر غضب، عجیب بات کہنے، ناز و ادا اور شوخی کرنے کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے اور اس کا انتساب حوروں کی طرف کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔

*** سوال ***

ہائے رے ذوقِ بے خودی، دل جو سنبھلنے سا لگا
چھک کے مہک میں پھولوں کی گرنے لگی صبا کی یوں

پورے شعر کا مفہوم وضاحت طلب ہے؟

*** توضیح و تشریح ***

"چھکنا" مست و سرشار ہونے، بے قابو و بے اختیار ہونے کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔ میر تقی میر کا شعر ہے۔

کچھ نہ پوچھو مہک رہے ہیں ہم
عشق کی مے سے چھک رہے ہیں ہم

مفہوم شعر:- بے خودی و سرشاری کی لذت وکیفیت کا کیا کہنا، اگر دل کبھی سنبھلنے سا لگتا ہے یعنی بے خودی و سرشاری کی کیفیت کچھ کم ہونے لگتی ہے تو صبا پھولوں کی خوشبو سے مست و سرشار ہوکر کہیں رُکتی نہیں، بلکہ افتاں و خیزاں ہرطرف چلتی رہتی ہے۔ اپنی افتادگی و بے خودی سے بتارہی ہے کہ سنبھلنے اور ہُشیار رہنے میں وہ مزا، وہ کیف ونشاط اور وہ بات نہیں جو عشق و محبت میں بے خود و سرشار ہونے میں ہے۔ خلاصہ یہ کہ عشق رسول میں ہمہ وقت بے خود و سرشار رہنا ہی اصل کیف ونشاط اور مدعاے حیات ہے۔

*** سوال ***

غفلت شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفل شیر خوار
کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں
مفہوم شعر؟

*** توضیح و تشریح ***

اس پورے شعر میں سب سے زیادہ تشریح طلب لفظ "بہائی" ہے۔ آیئے سب سے پہلے لفظ "بہائی" کی تشریح ملاحظہ فرمایئے:

"بہائی" — اہل ہند کے اعتقاد میں ایک روح ہے جو ننھے بچوں کو کھلایا کرتی ہے، جب وہ ان کے کان میں کچھ کہتی ہے کہ تیری ماں مرگئی تو بچے رونے کی صورت بنالیتے ہیں، یعنی بسورنے لگتے ہیں اور جب وہ بیان کرتی ہے کہ نہیں جیتی ہے تو ہنسی خوشی کی صورت بنالیتے ہیں — درحقیقت یہ خواب ہوتا ہے جو بچے دیکھ کر کبھی سوتے میں ہنسنے کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں کبھی رونے کی۔

اگرچہ عوام اسے بے حیائی بولتے ہیں مگر بعض شاعروں مثلاً قلق وغیرہ نے بھی اس میں دھوکا کھایا ہے۔

روتے روتے جو نیند آئی تھی
بے حیائی اسے ہنساتی تھی

مگر شیخ امداد علی بحر نے از روے تلفظ و املا اپنے شعر میں بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔

افسوس بہائی نے بھی مجھ کو
طفلی میں نہ عشق کی خبر کی (فرہنگ آصفیہ)

اس تشریح کے بعد اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے شعر۔

غفلت شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفل شیر خوار
کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں

بوڑھے اور جوان کی غفلت و بے خبری یعنی اپنے حقوق و فرائض کی ادائیگی سے غفلت، لاپرواہی اور عواقب سے بے خبری پر جب کہ وہ صاحب عقل و شعور ہیں۔ طفل شیر خوار جو ابھی صاحبِ عقل و شعور بھی نہیں، ہنستے ہیں۔ اور شیر خوار بچوں کو گدگدا کر ہنسنے اور خندہ زنی پر بہائی نے بے سود اور عبث نہیں اکسایا اور آمادہ کیا ہے، بلکہ شیخ و شاب کے صاحبِ فہم و ادراک ہونے کے باوجود اپنے فرائض و حقوق بندگی کی ادائیگی سے غفلت کی بنا پر ہنسنے پر مجبور کیا ہے اور یہ ہنسنا بطورِ محاورہ طنز کرنے، تمسخر اڑانے، مذاق اڑانے کے مفہوم میں اور زیادہ بلیغ اور بامعنی ہوجاتا ہے، گویا یہ شعر تلمیحاتی پس منظر میں درسِ عبرت بھی ہے اور حسن تعلیل کا خوب صورت نمونہ بھی۔ یا — در اصل بہائی کے گدگدانے کے سبب طفل شیرخوار کی ہنسی نہیں بلکہ خواب میں ان کا ہنسنا باقتضاے فطرت ہے اور اس ہنسی کو غفلت شیخ و شاب پر ہنسنے کی علت قرار دینا بطور حسن تعلیل ہے۔ حسن تعلیل وہ صنعت ہے جس میں حقیقۃً اگرچہ وہ علت نہیں ہوتی لیکن بطور مجاز اس کو اس کی علت قرار دیا جاتا ہے۔

*** سوال ***

حسرت نو کا سانحہ سنتے ہی دل بگڑ گیا
ایسے مریض کو رضا مرگ جواں سنائی کیوں
مفہوم شعر؟

*** توضیح و تشریح ***

عاشق صادق کو دیار حبیب میں پہنچنے کے وقت سکونت دوام کی تمنا تھی، مگر یہ جان کر وہ بیمار و حسرت زدہ ہوگیا کہ ایسا تیرا نصیب نہیں چند ایام گزرنے کے بعد یہ آرزو ہوئی کہ ہمیشگی اور دوام نہیں تو کچھ دن اور قیام کا موقع نصیب ہوجائے، لیکن کسی نے خبر دی کہ اس کی بھی گنجائش نہیں، بس آج کل میں تمھیں چلے جانا ہے۔ اب اس جوان اور تازہ آرزو کا بھی دم گھٹ گیا اور حسرتِ تازہ کے زخم سے دل کی حالت بالکل غیر ہوگئی کیوں کہ ایک بیمار کو مرگِ جواں کی خبر سنادی گئی، جس سے اس کی آس بالکل ٹوٹ گئی اور رہا سہا سکون و قرار بھی رخصت ہوگیا۔ ایسی حسرت انگیز اور جاں کاہ خبر کا تو نہ سنانا ہی بہتر تھا۔☆☆☆